مطبوعات

مولانا عبید اللہ سندھی: تالیف پروفیسر محمد سرور صاحب۔ مجلد۔ ضخامت ۳۸۴ صفحات۔ قیمت للعہ۔ سندھ ساگر اکیڈمی، شپل روڈ، لاہور۔

مولانا سندھی مرحوم، جن کی وفات زمانۂ حال کا ایک قومی سانحہ ہے، ان لوگوں میں سے تھے جو اپنے مقصد و تخیل کے پیچھے اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ لوگ بھی ان کے احترام پر مجبور ہیں جو ان کے خیالات سے اتفاق نہیں رکھتے۔ لیکن مولانا مرحوم اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا جتنا زبردست جوش و ولولہ رکھتے تھے، انھیں سمجھانے کی اتنی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اُن کا تخیل ایک شارح کا محتاج تھا جو ان کی بات کو سمجھ کر دوسروں کو اچھی طرح سمجھائے۔ یہی خدمت ان کے لائق شاگرد پروفیسر محمد سرور صاحب نے انجام دی ہے۔ خود مولانا سندھی مرحوم بھی اپنی زندگی میں اس کی توثیق فرما چکے ہیں کہ یہ ان کے مافی الضمیر کی اچھی ترجمانی ہے، لہٰذا یہ کتاب اس لحاظ سے، اور صرف اسی لحاظ سے خیر مقدم کی مستحق ہے کہ یہ قریبی عہد کے ایک ایسے صاحبِ فکر کی واضح ترجمانی کرتی ہے جو خود اپنے آپ کو اچھی طرح نہ سمجھا سکا تھا۔

لائق مولف نے اس کتاب میں مولانا مرحوم کے حالاتِ زندگی سے بہت کم تعرض کیا ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر مرحوم کے خیالات ہی کی طرف منعطف رہی ہے اور اس سلسلہ میں ان کا دائرۂ بیان بہت وسعت اختیار کر گیا ہے، حتیٰ کہ فلسفہ، مذہب، اخلاق، تصوف، تاریخ، اور سیاسیات کے بکثرت مسائل اس کی لپیٹ میں آ گئے ہیں۔ ایسی ایک وسیع المبحث کتاب، خصوصاً جبکہ وہ اپنے نقطۂ نظر میں کافی غرابت بھی رکھتی ہو، ایک مختصر تبصرے میں تنقید کا حق پوری طرح نہیں پا سکتی۔ مجملاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذکورۂ بالا مسائل کے بارے میں جو طرزِ فکر اس کے اندر پایا جاتا ہے وہ ہندوستان میں کوئی نیا طرزِ فکر نہیں ہے بلکہ نانک، کبیر، اکبر، دارا شکوہ اور رام موہن رائے وغیرہم کے ذریعہ سے پہلے بھی ہندوستان اس سے آشنا ہوتا رہا ہے۔ فرق اگر ہے تو روح میں نہیں بلکہ موادِ بحث، طریقِ استدلال اور تفصیلات میں ہے، اور سب سے بڑھ کر اس امر میں ہے کہ اس طرزِ فکر کو اسلام اور اصلی اسلام کا جامہ پہنا کر پیش کرنے کی اتنی بے باکانہ کوشش اس سے پہلے نہیں کی گئی تھی

ہمارا کام بھی نسبتاً بہت ہلکا اور کم ناخوشگوار ہو جاتا اگر ان خیالات کو محض ایک فکرِ آزاد کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہوتا لیکن چونکہ انھیں فکرِ اسلامی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، اور بتکرار ان دعووں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ اصل دین یہ ہے نہ کہ وہ جو مولانا سندھی سے اختلاف رکھنے والے سمجھے ہیں، اس لیے ہم اس دلی تکلیف کے ساتھ جو مولانا مرحوم کے ہر مخلص نیاز مند کو ان کی وفات کے اس قدر قریب زمانہ میں ان کے خیالات پر تنقید کرتے ہوئے محسوس ہونی چاہیے، بعض ایسے بنیادی امور کی طرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جو اس مجموعۂ افکار میں اسلامی طرزِ فکر سے صریحاً متصادم نظر آتے ہیں۔

"تمام مذاہب کی تعلیمات کو الگ رکھ کر تاریخِ انسانیت کا مطالعہ کرو تو اصولِ ارتقا اور اصولِ تبدل مل جائیں گے"

اگر یہ سچ ہے تو سوال یہ ہے کہ پھر سلسلۂ نبوت و وحی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم تاریخ انسانیت کے مطالعہ سے خود اپنے لیے حسب ضرورت قانونِ ارتقا مستنبط کر سکتے ہیں۔ دنیا کا ہر نظام پچھلے تجربات سے استفادہ کرکے ہی بنتا ہے۔ پھر آخر پیغمبر کس لیے آتے رہے؟ منکرین ہی اس کام کے لیے کافی تھے۔ دراصل اس نظریہ میں ایک غلط فہمی چھپی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخ انسانیت کے تجربات ہماری رہنمائی کرتے ہیں مگر ان سے ترقی و تنزل کے قوانین اخذ کرنے اور واقعات کے اسباب و علل تلاش کرنے کے لیے جس ہمہ بیں نظر اور جس بے لاگ تفکر کی ضرورت ہے وہ کسے حاصل ہے؟ کون ایسا انسان ہے جو تمدن کی مشینری کے پیچیدہ اجزا کے عمل و تعامل کو بہمہ وجوہ سمجھتا بھی ہو اور پھر ان سے نوامیس عاملہ کو تلاش کرتے وقت خواہشات، جذبات اور تعصبات سے اپنے ذہن کو یکسر خالی بھی کر سکے۔ انسان کی یہی کمزوری نبوت کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے۔ اگرچہ نبی جو قانونِ اخلاق اور نوامیس حیاتِ اجتماعیہ پیش کرتا ہے ان کے لیے وہ بھی استشہاد تاریخ انسانیت ہی سے کرتا ہے، مگر اس کی آنکھ جہالت اور خواہش اور تعصب کے شیشوں سے ڈھکی ہوئی نہیں ہوتی۔

"مولانا کا یہ عقیدہ ہے کہ زمانہ کا تقاضا خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے اور زندگی کے اسباب و

حالات جس نظام کے متقاضی ہوتے ہیں، خدائی مصلحت اسی نظام کو دنیا میں نافذ کرنا چاہتی ہے۔"

یہاں قضائے الٰہی اور رضائے الٰہی کے فرق کو نظر انداز کرکے ایک ایسی عظیم الشان بنیادی غلطی کی گئی ہے جسے اگر اس کے منطقی نتائج تک پہنچا دیا جائے تو ضلالت و ہدایت، فسق اور طاعت، صلاح اور فساد سب یکساں حق ٹھہرتے ہیں، بلکہ حق اور باطل کا امتیاز ہی سرے سے ختم ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ اقتضائے زمانہ سے جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ مشیت یا قضائے الٰہی کے تحت ہی رونما ہوتا ہے، مگر حق پر یہ کتنا بڑا ظلم ہوگا کہ جو کچھ زمانے کے تقاضے سے رونما ہو اسے حق کہہ دیا جائے۔ "زمانہ کا تقاضا" ہی اگر تعمیر مستقبل کے لیے محرک اور اساس ہو تو پھر افق کے "اس طرف سے" کسی جداگانہ فوق الفطری تحریکِ اصلاح و انقلاب اور تعلیم حق کے آنے کی کیا حاجت باقی رہ جاتی ہے؟ زمانہ کا تقاضا تو قوموں کو ہر راہ پر چلاتا ہے چاہے وہ راہ عیاشی کی ہو، سرمایہ پرستی کی ہو، الحاد کی ہو، یا ظلم کی، اور پھر قومیں جس راہ پر بھی جانا چاہتی ہیں قضائے الٰہی ان کے حق میں ہی کا فیصلہ کر دیتی ہے۔ مگر اس سے بڑی کوئی گمراہی نہیں ہو سکتی کہ اس قضاء کو حجت قرار دے کر ایسی سب راہوں کو صراطِ مستقیم سمجھ لیا جائے

"تمام موجودات میں جو چیز مشترک ہے وہ وجود ہے...... اس وجود سے ہو نام ادنہیں، بلکہ وہ حقیقت مراد ہے جس کی بنا پر ہم کسی چیز کو موجود کہتے ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بلا کسی موجود کرنے والے کے موجود ہے... اب جو چیزیں اس وجود کے علاوہ مخلوقات میں پائی جاتی ہیں، وہ اعتباری ہیں، اس لیے اگر وجود نہ ہو تو ان سب کا خاتمہ ہو۔ لہٰذا یہی وجود خدا تعالیٰ کا عین ذات ہے اور دنیا کی جتنی چیزیں ہیں ان سب کی حقیقت یہی وجود ہے۔" (بحوالہ شاہ محمد حسین صاحب الٰہ آبادی)

یہاں اس عقیدہ کی عقلی اور نقلی غلطیوں پر بحث کرنے کا موقع نہیں، مختصر یہ ہے کہ یہ ایک شدید ترین گمراہی کا فلسفہ ہے جسے صوفیوں کے ایک گروہ سے سندِ حقانیت مل جانے کے باعث تقدس کا مقام حاصل ہو گیا۔ اس کی جو تقریر مصنف نے شاہ محمد حسین صاحب کے حوالہ سے نقل فرمائی ہے اس کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ نکلیں گے کہ تمام موجودات کے اندر خدا خود کام کر رہا ہے، اور جب یہ بات ہے تو پھر دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے صحیح ہو رہا ہے، غلطی کا اس میں کچھ کام نہیں۔ یہی عقیدہ اقتضائے زمانہ (تاریخ) کو "ارادۂ ربانی" بنا دیتا ہے اور پھر انسان کو اس بات پر آمادہ کر دیتا ہے کہ رفتارِ زمانہ پر یہ سمجھتے ہوئے بہتا چلا جائے کہ یہ سب کچھ منشائے الٰہی ہے۔ اسی عقیدے سے ہیگل کا تصورِ تاریخ پیدا ہوا ہے جس کا

مدعا یہ ہے کہ اعتباری تشخصات و تعینات کے اندر جو جوہر اصلی کام کر رہا ہے وہ ہر جگہ ایک ہی ہے اور وہ دو متضاد طاقتوں کا روپ دھار کر کے تصادم در تصادم کا معرکہ چھیڑے ہوئے ہے تاکہ اپنی تکمیلی منزل کو پہنچ سکے۔ تاریخ کا یہ باطل تصور منجملہ اور بہت سے غلط نتائج کے، ہم کو اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ نوعِ انسانی اضطرارًا سیدھی ارتقاء کی راہ پر بڑھی چلی جا رہی ہے۔ حالانکہ اسلام کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان جب انبیاء کی ہدایت کو مان لیتا ہے تو تاریخ ارتقا کرتی ہے اور جب وہ اس ہدایت سے روگردانی کر لیتا ہے تو تنزل شروع ہو جاتا ہے۔

"تمام انسانوں میں ایک وحدتِ فکری ہے اور ان میں یہی ایک نقطہ اشتراک ہے اور اسی سے ادیان اجتماع اور اقوام کے اختلافات کم ہو جاتے ہیں۔ نیز قرآن اور دوسری الٰہی کتابیں اسی وحدتِ فکری کی ترجمان ہیں"

یہ وحدتِ ادیان کے اُس تصور کی ایک ذرا سی جھلک ہے جسے مصنف نے مولانا مرحوم کی ترجمانی کرتے ہوئے کافی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اول تو یہ تصور وحدۃ الوجود کے اس فلسفے کا قدرتی اقتضاء ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، مزید براں مولانا مرحوم نے جس طرح نیشنلزم اور بین الاقوامیت کو یکجا جمع کیا تھا اُس کا بھی یہ لازمی تقاضا تھا کہ ایک طرف تو وہ بین الاقوامیت کی خاطر (اور ہندوستانی نیشنلزم کی خاطر بھی) وحدتِ ادیان کا ایک فلسفہ وضع کرتے اور دوسری طرف مخصوص مذہبی شرائع اور قوانین اور تہذیبی صورتوں کو قومی خصوصیات قرار دے کر ان کے ترک و اختیار کی آزادی تمام قوموں کے لیے ثابت کرتے۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا ہے۔ وہ چند مطلق (بے صورت) صداقتوں کو اصل دین قرار دے کر کہتے ہیں کہ وہ تمام ادیان اور تمام انسانوں میں مشترک ہیں اور قرآن در اصل انھیں کی طرف دعوت دینے آیا ہے، پھر ان شرائع اور سنن کو جو قرآن اور اسوۂ محمدی میں مقرر کی گئی ہیں اور جن پر عہدِ نبوت و خلافتِ راشدہ میں مذہبی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کی تشکیل کی گئی تھی محض قومی رسوم قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان رسوم کو عالمگیر قانونِ زندگی بنانا مقصود نہ تھا بلکہ دینِ مطلق کے اندر ان رسوم کو قومی حالات و ضروریات کے مطابق ڈھالنے اور بدل لینے کی گنجائش ہے۔ مصنف کے الفاظ میں اس کی تقریر ملاحظہ ہو:

ا۔ "جو پانی بہہ جاتا ہے وہ لوٹتا نہیں۔ قرآن پر عمل کر کے خلافتِ راشدہ کے دور میں صحابہ نے جو حکومت بنائی، اب بعینہٖ ویسی ہی حکومت نہیں بن سکتی"۔

ب۔ "قرآن کی تعلیم کا نتیجہ ایک زمانہ میں ایک خاص مظہر میں جلوہ گر ہوا۔ اب ضروری نہیں کہ دوسرے زمانہ میں وہ پھر بعینہٖ اسی صورت میں ظاہر ہو"۔

ج۔ "اگر صرف پہلے کے بنے ہوئے شرائع و آئین پر ہی سارا انحصار ہے تو پھر قرآن کی اثر آفرینی کا انجام ظاہر ہے"۔

د۔ "اسلام کی اجتماعی اساسی تحریک قرآن شریف میں منضبط ہے اور وہ غیر متبدل رہے گی لیکن جہاں کہیں کسی قانون پر عمل درآمد شروع ہوتا ہے تو مخاطبین کی حالت کے مطابق چند تمہیدی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ قانونِ اساسی تو غیر متبدل ہوتا ہے لیکن تمہیدی قوانین ضرورت کے وقت بدل سکتے ہیں۔ ہم سنت انہی تمہیدی قوانین کو کہتے ہیں"۔

س۔ "مولانا کے نزدیک بھی کہیں کہیں جو احکام ہیں وہ در اصل ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احکام کو اپنی خاص شکل میں ابدی اور عالمگیر ماننا صحیح نہیں"۔

ایک مختصر تبصرے میں زیادہ اقتباسات کی گنجائش نہیں نکل سکتی تاہم ان چند اقتباسات سے مولانا کے خیالات کا بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔
ایک فلسفی ہونے کی حیثیت سے ہر سوچنے والے کو ہر بات سوچنے کا اختیار حاصل ہے، مگر یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ قرآنی تعلیمات اور سنت محمدی کے ایک حصے کو دائمی اور عالمگیر اور دوسرے حصے کو قومی اور وقتی قرار دینے اور پھر بلا دلیل و سند یہ کہنے کا کسی کو کیا حق ہے کہ دراصل یہی قرآن اور پیغمبر صلعم کا مدعا تھا اس کے بعد مولانا کے تخیل کی آخری منزل ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ شرائع اور سنن کو وقتی اور قومی قرار دینے کے بعد مولانا یہ چاہتے تھے کہ اس دینِ مطلق کو جس کا تصور اوپر بیان ہوا ہے لے لیا جائے اور اس کے ساتھ قرآنی و محمدی شرائع و سنن کے بجائے ان شرائع و سنن کا جوڑ لگا دیا جائے جو ہم کو یورپ اور اشتراکی روس وغیرہ سے ملتے ہیں۔ ان کے نزدیک یورپ اور اشتراکی روس کے طریقوں میں اگر کوئی قصور ہے تو صرف یہ کہ ان کے ساتھ دینِ مطلق کا جوڑ لگا ہوا نہیں ہے۔ اس مضمون کو بھی مصنف نے کافی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ نمونہ کے طور پر صرف چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

> "میں چاہتا ہوں کہ یورپ کی اس مادی ترقی کو تسلیم کر لیا جائے یعنی علم اور سائنس کی ترقیوں کو ہم اساس کی حیثیت دیں"
>
> "میں مادیین کے تصورِ کائنات کو سرے سے غلط نہیں مانتا لیکن اسے ناقص ضرور سمجھتا ہوں۔ مادی فکر کا منکر نہیں ہوں لیکن یہ جانتا ہوں کہ مادیت حقیقت کا صرف ایک رُخ ہے اور یہ رُخ بے شک حقیقت کے ایک پہلو کا صحیح ترجمان ہے۔"
>
> "اس میں شک نہیں کہ اشتراکیت مادی زندگی کی تنظیم کا منتہائے کمال ہے۔"
>
> "یہ روس بالکل لادینی تھا اور مولانا پکے دیندار لیکن مولانا کی دینداری نے انقلابیوں کی اس لادینی میں بھی صحیح جذبہ کو سرگرمِ عمل پایا....... آپ نے کھلے دل سے روسی انقلاب کی ہر اچھی چیز کو سراہا اور انقلاب برپا کرنے والوں کی معجزانہ قوتوں کو تسلیم کیا لیکن اس کے باوجود آپ مسلمان ہی رہے۔"

صاف اور سیدھی زبان میں اگر اسے بیان کیا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ صرف چند مطلق مذہبی تصورات قرآن سے لے لیے جائیں۔ اور قرآن ہی سے کیوں؟ وہ تو تمام مذاہب و ادیان میں ہیں ہی مشترک!۔۔۔ رہی شریعت اور تہذیب و تمدن و معاشرت کی مخصوص شکل، تو اس معاملہ میں قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ پیش کیا تھا وہ صرف عرب کی قوم کے لیے تھا، لہٰذا ہمیں آزادی ہے کہ اسے کلیۃً یا جزءً اپنے لیے منسوخ ٹھیرا کر شریعتِ فرنگ اور سننِ روسیہ کو اختیار کریں۔

تخیل کی ان بے پایاں وسعتوں کو لیے ہوئے مولانا جب تاریخ اسلام پر نگاہ ڈالتے ہیں تو انھیں خلفائے راشدین، بنو امیہ، بنو عباس، اکبر اور اورنگ زیب سب ہی یکساں قابلِ قدر اور قابلِ تعریف نظر آتے ہیں کیونکہ مذکورۂ بالا نظریات کو ایک نظامِ فکر کی شکل میں مرتب کر کے جو شخص بھی دنیا پر نگاہ ڈالے گا اسے باطل تو کہیں نظر آ ہی نہیں سکتا، تمام مختلف چیزیں خواہ وہ بالکل ایک دوسرے کی ضد ہی کیوں نہ ہوں، اس کے تخیل کی فضائے مطلق میں حق کی حیثیت سے جگہ پا سکتی ہیں۔

اگر ہم حسنِ ظن سے کام لیں، تو کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم کے نظامِ فکر کے بیشتر اجزاء ایسے تھے جو ان کا اصل عقیدہ و مسلک نہ تھے بلکہ انہوں نے یہ ایک جدید علم کلام محض اس لیے مرتب کیا تھا کہ ان کے نزدیک موجودہ زمانہ میں دین کی دعوت انہی اصولوں پر پھیلائی جا سکتی تھی، لیکن اس حسنِ ظن کے باوجود ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ یہ فلسفہ و کلام قطعی غلط اور سراسر ضلالت ہے اور اگر دین کی دعوت پھیلنے کی بس یہی ایک صورت رہ گئی ہے تو اس طرح اس کے پھیلنے سے نہ پھیلنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ مولانا مرحوم کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ ان کا تعلق علمائے کرام کے اس طبقے سے تھا جو اپنی گروہ بندی کی عصبیت میں حدِ کمال پر پہنچا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا یہ سب کچھ فرما گئے اور لکھوا اور چھپوا بھی گئے اور

پھر بھی تنقید کی رہائیں بند اور تعریف کی زبانیں تر رہیں، ورنہ اگر کہیں انھوں نے اس طبقہ خاص کی باہر جگہ پائی ہوتی تو ان کا استقبال سرسید اور علامہ مشرقی کی کچھ کم شاندار نہ ہوا ہوتا۔

شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ :۔ از مولانا عبید اللہ سندھی، مرحوم۔ مجلد ضخامت ۲۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر۔ سندھ ساگر اکادمی، لاہور۔

یہ مولانا مرحوم کے اس مقالہ کی جدید ترتیب اور تسہیل ہے جو مولانا نے جریدۂ الفرقان، بریلی کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لیے لکھا تھا۔ پروفیسر محمد سرور صاحب نے اس کی زبان کو سہل اور اس کے مطالب کو عام ناظرین کے فہم سے قریب تر کرنے کی اچھی خاصی کامیاب کوشش کی ہے۔ اگرچہ اس مقالہ میں مولانا مرحوم نے اپنے مخصوص فلسفہ اور نظریات کو بھی شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم کی تشریح میں داخل کر دیا ہے، مگر اس کے باوجود یہ مقالہ اس امر کی ایک زندہ شہادت ہے کہ مولانا مرحوم کی نظر حضرت شاہ صاحب کے لٹریچر میں نہایت عمیق تھی۔ علاوہ بریں کوئی شخص جو اس کا مطالعہ کرے، یہ اثر لیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مولانا فی الحقیقت ایک بڑے دقیقہ رس اور وسیع النظر عالم تھے۔

ضروری اعلان

[illegible] موجود ہیں

خطبات۔	۱۲ر	اسلام اور جاہلیت۔	[illegible]
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول	عہ	سلامتی کا راستہ۔	[illegible]
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم	۱۲ر	نیا نظام تعلیم	[illegible]
روداد جماعت اسلامی حصہ اول۔	۱۳ر	انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل۔	۶ر
رسالہ دینیات	۸ر	ایک اہم استفتاء	۲ر
مسئلہ قومیت	۸ر	اسلامی حکومت .... کا انگریزی ترجمہ۔	۹ر
تنقیحات	۱۲ر	نیشنلزم اینڈ انڈیا۔	۹ر
ہیگل، مارکس اور نظام اسلام۔	۱۲ر	راہ عمل (سیاسی کشمکش سوم کے دو مضمون)	۶ر
حقوق الزوجین	۸ر	دین حق	۶ر
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	۱ر	ایمان کی کسوٹی۔	۲ر
اسلام کا نظریہ سیاسی	۶ر	لا الٰہ الا اللہ کے معنی۔	۲ر

دیگر مکتبوں کی مندرجہ ذیل کتابیں بھی موجود ہیں۔

(۱) الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر۔ قیمت ۳ ر (۲) حقیقت شرک۔ قیمت ۸ر۔ (۳) اسلام کا استغاثہ قیمت ۶ر۔ (۴) ذہنی زلزلے قیمت ۱۲ر۔ (۵) تماہا۔ قیمت ۶ر۔ (۶) مذہب کا انقلابی تصور۔ قیمت ۶ر۔ حقیقت نفاق قیمت ۶ر۔

مکتبۂ جماعت اسلامی۔ دار الاسلام پٹھان کوٹ (پنجاب)